مذہب تو میں کبھی کا چھوڑ چکا۔ بابا جان، مجھے اس اللہ سے کوئی واسطہ نہیں جو ظلم ہوتے دیکھتا ہے اور چپ رہتا ہے..... میں اس کی منطق سمجھ نہیں سکتا۔

ابھی گیارہ ستمبر کا زخم تازہ ہے۔ ابھی پنڈولم غم و غصہ کی طرف سفر کر رہا ہے، لیکن وہ وقت آئے گا جب سکون و راحت کی طرف بھی پنڈولم جائے گا..... پھر یاد رکھنا کہ سکون اور راحت سوائے اوپر والے کے کسی کے پاس نہیں"۔

یہ بھی آپ کا خیال ہے دنیا کی ہر شے کا پیمانہ انسان ہے اور اس کے پاس غم و غصے کے علاوہ کچھ نہیں۔

بالکل بالکل انسان ہی پیمانہ ہے جس سے دنیا کی ہر شے ناپی تولی جا سکتی ہے، لیکن معیار ہمیشہ مسلم ہوتا ہے عزیزی..... جانتے ہو جب میٹر ہاتھ میں لیں اور کپڑا ناپیں تو سارے ملک میں میٹر کی لمبائی ایک ہوتی ہے۔ کلو، پونڈ، گرام ہر مقام پر وزن میں ایک ہوتے ہیں..... ہر انسان پیمانہ نہیں ہو سکتا..... پیمانہ بھی ایسا ہونا چاہئے جو ہر عہد میں ہر مقام پر پورا ہو.....

"ہاں..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں بابا جان....."

یہی تو سوچنے والی بات ہے جان من..... انسان پیمانہ نہیں، نبی پیمانہ ہے..... اسی پر عمل تولا جا سکتا ہے، اسی پر لبرل ازم کو جانچا جا سکتا ہے۔ وہی سوچ کی درستگی کا ضامن ہے۔ بغیر نبی کے تو انسان کو پرکھنے، جانچنے، ناپنے کے لئے اپنی اپنی عقل درکار ہوگی اور تم جانتے ہو ہر انسان کی عقل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہر معمولی انسان کی عقل یونیورسل پیمانہ نہیں بن سکتی اور تم یہ بھی سمجھ لو، اسی لئے نبی کا امی ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے پاس انسانی علم نہ ہو کوئی ڈگری، کوئی تعلیم نہ ہو، وہ کسی علم کی طرف پہلے سے راغب نہ ہو، اس کی ہوٹ لائین رب سے ڈائریکٹ ہو اور وہ اسی علم کے مطابق تعلیم دے اور اسی قدر اور وہی تعلیم دے جس کا امر ہو۔

وہ ایک لمبی سانس لے کر اٹھا..... بس بابا جان بابا جان بس..... میں اب کسی اللہ

کسی نبی کو ماننے کے لئے تیار نہیں..... میں جانتا ہوں..... ہم افغانیوں سے کہیں کوئی غلط عمل ہوا ہے یا پھر..... ہم ضرورت سے زیادہ مذہب پرست تھے۔ اس کی بھی تو سزا ہوتی ہے ناں آدرشوں کے لئے مرنا پڑتا ہے ناں..... اپنے مسلک کے لئے جان سے ہاتھ دھونا کبھی کبھی ضروری ہو جاتا ہے۔

اے نفس کے چیلے! بیٹھ جاؤ اپنے لئے امید رکھو..... بغیر امید کے انسان شیطان کا چیلا بن جاتا ہے۔ ہم اس قدر لبرل نہیں ہو سکتے کہ ہمارے لئے کوئی امید ہی باقی نہ رہے۔

وہ کسی اور دنیا میں گم تھا۔

میں اس کے ساتھ اٹھا، لیکن اس نے میرے ساتھ چلنا گوارا نہ کیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ بائی لین کراس کر کے اس مڑتی گلی میں غائب ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا، لیکن میرے ہاتھ میں ہاف اینڈ ہاف Container تھا اور ارجمند دودھ کا انتظار کر رہی تھی۔

فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

میں چونگا اٹھا کر کندھے اور کان میں فٹ کر لیتا ہوں اور وہ واشنگ مشین میں برتن بھی فٹ کرتا جاتا ہوں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کئے جاتا ہوں۔

ابو آپ پلیز کچھ دن کے لئے ہمارے پاس آ جائیں بہو شاہدہ کہتی ہے۔

''ہاں وہ..... آنا تو تھا، لین یہ بچے اب مجھ پر پوری طرح قابض ہو چکے ہیں''

میرا بچہ بھی تو آپ پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ چاہے چند دنوں کے لئے ہی سہی اس کی آواز میں روٹھنے کی ٹون تھی۔

کیوں نہیں کیوں نہیں..... ضرور، ضرور..... میں خوفزدہ بڈھے کی طرح بولا۔

ابھی آ جائیں ناں پھر اگلے ہفتے ہمیں آنٹی اقبال کی طرف لانگ آئی لینڈ جانا ہے۔

پتہ نہیں کیوں میرے سارے پروگرام امریکہ پہنچنے کے بعد آنٹی اقبال کے تابع

ہو گئے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا، آنٹی اقبال چھلاوہ تھی اور میں اس کے پیچھے بھاگنے والا۔

یہ تمہاری آنٹی اقبال نہیں چھوٹتیں شاہدہ؟ کہاں جاؤ گی اتنی دور.....

یہاں کوئی جگہ دور نہیں۔ ہم امریکی لوگ ہوائی جہاز سے زیادہ کار کے سفر کو پسند کرتے ہیں ابو ..... بچے کو انفرمیشن ملتی ہے۔ سارے راستے میں اتنے اچھے Motels ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا سفر کا.....

اچھا بھئی اچھا جاؤ اپنی آنٹی اقبال کے..... ہم سے تو ہی اچھی.....

شاہدہ پاکستان والی بہو نہ تھی۔ یہاں فیملی نہیں تھی، اس لئے اسے میری بھی کچی پکی ضرورت تھی۔

آپ نہیں جانتے ابو ..... جب میں پہلے پہل یہاں آئی ہوں تو آنٹی اقبال نے میری کیسے مدد کی..... بالکل ماں کی طرح ..... ہارون تو ان سے اتنا ہل گیا تھا..... اتنا ہل گیا تھا.....

ماں کی طرح.....

ماں کی طرح.....

میں دیر تک فون پر جہانگیر سے باتیں کرتا رہا، لیکن کہیں دماغ میں ایک جھینگر گھس کر کہتا رہا ماں کی طرح ..... ماں کی طرح۔ اقبال کے متعلق میں عجیب سے مغالطے میں مبتلا ہوں۔ مجھے ایک کہانی یاد آ رہی ہے۔

ہرات کے بادشاہ کی بیٹی چاند کا ٹکڑا تھی۔ جدھر سے گزر جاتی، دیکھنے والے ششدر رہ جاتے۔ ایک روز اپنی پالکی میں سوار بازار سے گزری۔ پالکی بردار حبشی زنخے ایک عطار کے سامنے رکے۔ شہزادی نے پالکی کا پردہ اٹھا کر دکاندار سے بات کی۔

اس وقت سیڑھیوں پر ایک درویش بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا زمین پر آ رہا اور سانس بند ہونے کو آئی۔ شہزادی نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ اب تو درویش پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ نیم دیوانہ جذب کی کیفیت میں چلا گیا۔ اسی طرح وہ

سات سال ان ہی سیڑھیوں پر بیٹھا شہزادی کے لوٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ رات کے وقت آوارہ کتے اس کے ساتھ آ کر لیٹ جاتے، دن میں بلیاں اس کے اردگرد منڈلاتی رہتیں۔ لوگ اسے مجذوب سمجھ کر روٹی ڈال دیتے۔ کچھ دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے، لیکن درویش وہیں بیٹھا رہتا۔ عطار بالآخر اس سے اس قدر بیزار ہو کر مارنے کی ٹھانی۔

اتفاق ان ہی دنوں ایک بار پھر شہزادی کا ادھر رخ ہوا۔ جونہی اس نے شہزادی کو دیکھا، سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ اس نے شہزادی سے کہا..... ایک سال ے اگر اس کا جواب دے ڈالے تو میں ہرات چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

پوچھ کیا پوچھتا ہے۔

اے چودھویں کے چاند! اس روز تو مجھے دیکھ کر مسکرائی کیوں؟

شہزادی دوبارہ مسکرا کر بولی..... ''تیری ہونق حالت دیکھ کر محظوظ ہوئی، تجھ پر ترس آیا اور مسکرا دی..... اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا''۔

سر جھکا کر درویش بولا..... ٹھیک ہے آپ کی ادا ٹھہری۔

شہزادی عطار میں مشغول ہو گئی، درویش نے اپنا آپ سنبھالا اور ہرات سے رخصت ہو گیا۔

کہتے ہیں اس ملاقات کے بعد درویش کو ہوش آ گیا اور وہ بغداد شہر میں مدہنے لگا۔ وہ شہر کا مشہور ترین مصور تھا، لیکن تعجب ہے کہ وہ ہر تصویر میں ایک ہی شہزادی پیش کیا کرتا۔ اس نے ہزار تصویریں بنائیں۔ گو شہزادی وہی رہتی، لیکن اس کی ایک تصویر دوسری سے نہ ملتی تھی۔ اس نے سات سال دیوانہ رہ کر زندگی کی نیرنگی کو یک رنگ کر لیا تھا۔

جمشید اور قیصر بڑے خود مختار بچے ہیں۔ وہ ہرگز مجھ پر قابض ہو کر اپنے آپ کو پابند نہیں کرنا چاہئے۔ میں سینگ کٹا کر کبھی کبھی بچھڑوں میں شامل ہو جاتا ہوں۔ اس

وقت ہم تینوں پیکن آئس کریم کھانے میں مشغول تھے۔

''دادا لاہور میں پیکن آئس کریم ہوتی ہے.....''

ہوتی ہے، لیکن وہاں کفی ہوتی ہے زیادہ.....کلفا ہوتا ہے۔

کفی.....کلفا وہ دونوں یہ لفظ سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ وہ عام طور پر ایسے لفظوں کا گانا بنا کر ایک دوسرے کو چڑایا کرتے۔ جمشید نے امریکی ریپ دھن میں کہا کلفا کلفا۔ Sat in a Saucer Crying for the old man To come for a Boxer.

کلفا.....کفی.....یو.....یو.....یو

کلفا.....کفی.....ہو.....ہو.....ہو

اب دونوں نے مل کر اسے گانا شروع کیا۔ ان کے جوگزرنے لکڑی کے فرش پر ایک خاص قسم کا ردھم قائم کرلیا، جو ان کے لئے بھی مسحور کن تھا اور میرے لئے بھی.....اس وقت ارجمند پہلی منزل پر وارد ہوئی۔ اس کے ہاتھوں پر کندھے کے ساتھ گروسیرز کے تھیلے پیکٹ شاپر تھے۔ وہ فرانسیسی بیکری سے ڈبل روٹی، چینی دکان سے چاول، ہندوستانی شاپ سے اچار چٹنیاں، لبنانی نان بائی سے روٹیاں اور اطالوی شاپ سے پیزا لائی تھی۔ سوائے باسمتی کے اس کے سامان میں کچھ پاکستانی نہ تھا۔

''ہائے توبہ.....پھر پھر کے دیکھ دیکھ کے بھر کس نکل گیا ابو.....''

اسی شاپنگ کے باعث اس کا بہت سارے نسلی گروپوں کے ساتھ تال میل رہتا تھا۔

ایک ہی مارکیٹ سے سب کچھ خرید لیا کرو۔

ناں ابو.....ایک ہی مارکیٹ میں چوائس نہیں ملتی.....

چوائس بھی آج کے عہد کا اور ترقی کا بہت بڑا شاخسانہ ہے۔ اسی چوائس نے Consumers Society میں روح پھونک رکھی تھی۔ اشیاء تک تو خیر تھی، لیکن

اسی چوائس کی بدولت طلاق کی شرح بھی بڑھ گئی تھی۔ اسی کی بدولت بیروزگاری کا ہوا دندناتا پھرتا تھا اور اسی پسند ناپسند کے باعث انسان ہر شہر میں اکتایا رہتا تھا۔ نئی نسل نے اسی پسند ناپسند کے باعث خودسری سیکھ لی تھی۔ جس بچے سے ماں روز صبح پوچھتی ہو۔ ''انڈہ بائیل، سنی سائیڈ اپ یا آملیٹ'' وہ بچہ صاحب رائے ہوجاتا ہے پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس رائے میں ایسی پختگی آجاتی ہے کہ وہ کسی اور کی رائے برداشت نہیں کرسکتا۔

سامان کو جگہ رکھتے ہوئے ارجمند بولی میں نے کہا تھا آج آئس کریم کی اجازت نہیں۔ تو آئس کریم ٹوڈے......

دادا نے کہا تھا جمشید نے الزام مجھ پر دھرا۔

سو واٹ ماما......وائی ناٹ آئس کریم۔ قیصر نے سوال کیا۔

وہائی؟ ......کیوں......کس لئے؟ بچے ہر لمحہ سوال ہیں۔

کیوں کہ ہم لانگ آئی لینڈ جارہے ہیں۔

کہاں ماما؟ کہاں......

کہاں......؟ کون سی سمت میں۔ کس قدر؟ آج کی پود سوال ہے، مکمل سوال۔

لانگ آئی لینڈ......وہاں ہمیں انکل نثار نے بلایا ہے؟ یاد ہیں انکل نثار......

''یاد ہے ماماں That tall guy''

ود براؤن Whiskers

وہ دونوں کسی پرانی یاد کو آپس میں شیئر کرکے مسکرانے لگے......پھر جمشید نے آہستہ گایا۔

Uncle Nisar was little baby

Sitting on his Mama,s Knee

Big bend tunnel on C + O

وہ دونوں شرارت سے ہنسنے لگے۔ان کے لطیفے کا میرے اور ارجمند کے پاس کوئی سرا نہ تھا۔یہ ان کا کوئی ذاتی جوک تھا۔

بلال کی ایک یہ بھی ہابی ہے۔وہ کمپیوٹر پر بیٹھ کر نئے راستے نکالتا رہتا ہے۔ اس کے جو کاغذات ڈسٹ بن سے نکلتے ہیں۔عموماً اس پر راستوں کے نقشے ہوتے ہیں۔میں تو شاید یہ نقشے پڑھ کر سفر نہیں کر سکتا،لیکن اسے خوب مہارت ہے۔ایسے ہی ایک نقشے کے سہارے ہم لانگ آئی لینڈ کی طرف رواں دواں تھے۔

US Route 1 South 18.3 miles

Benn turn Pike exit 24 miles

Pike Portions tolls

1 - 76 East (Exit 24, tolwards)

Philadelphia 1-476

Valley forge. (U.S 202)

Merger 1-76 E

وہ میامی سے نیویارک 1340 میل ساؤتھ کے راستے کا نقشہ بنا کر کئی دن فائل میں رکھ کر پھاڑ دیتا ہے۔اسے لاس اینجلز سے 2875 میل کا سفر اگر کار سے کرنا ہوت تو اسے بخوبی راستہ آتا ہوتا ہوگا۔شمال میں اگر وسکانسن سیٹ سے اسے نیویارک پہنچنا ہوتو وہ راستے نہیں بھولتا۔کیونکہ وہ جانتا ہے مشرق، مغرب،شمال، جنوب کے حساب سے چلنے والی مین U.S راؤٹ کو کہاں پکڑنا اور کہاں چھوڑنا ہے۔ ہر میجر سے بہت پہلے وہ تیار ہوتا ہے اور Exit کا اسے بخوبی علم ہوتا ہے۔وہ کہیں جائے نہ جائے، پلان اس نہایتی کیطور پر بنا رکھا ہوتا ہے۔اسے بھی شائد اصلی شاہراہ کی تلاش ہے۔جسے وہ دنیاوی راستوں میں ڈھونڈتا ہے۔

ہم مسز نثار سے ملنے لانگ آئی کہ طرف روانہ ہیں۔راستے میں ہم بار بار Hov

والی سڑک پکڑتے ہیں، جو چار رویہ سڑکوں پر بالکل بائیں ہاتھ اور آخری ہوا کرتی ہے۔اس پر وہ کاریں چلتی ہیں، جن میں دو سے زیادہ سواریاں ہوں۔عموماً پولیس کی کاریں کہیں نہ کہیں جھاڑیوں میں چھپی، کسی نشیب میں نقاب لگائے تیز رفتار گاڑیوں کو اچانک اوورٹیک کر کے روک لیتی ہیں۔پولیس بہت منظم اور مددگار ثابت ہوتی ہے، لیکن تیز رفتاری کے معاملے میں ٹکٹ بھی ضرور دیتی ہے۔بلال بھی دو ایک بار یہ ٹکٹ حاصل کر کے جرمانہ بھر چکا ہے۔

ہم سٹیشن ویگن میں سوار ہیں۔ارجمند اور بلال سامنے والی سیٹوں پر، بچے بالکل بیک پر ہیں اور میں درمیان میں دو والی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔میری سیٹ کے سامنے چھوٹا سا ٹیلی ویژن بھی لگا ہے، جسے جمشید اور قیصر کبھی کبھی آگے جھک کر دیکھتے ہیں۔

بلال ڈرائیو کرتے ہوئے جمشید اور قیصر سے کہتا ہے ایک ڈچ آدمی پیٹر منیوٹ نے چوبیس ڈالر کے ٹرنکس کے بدلے مین ہیٹن جزیرے کو ریڈ انڈین لوگوں سے خریدا۔ اس کے بعد اس ڈچ جزیرے کو انگریزوں نے چھین لیا، لیکن دس پندرہ سال کے بعد پھر مین ہیٹن آئی لین ڈچ ملکیت بن گئی۔جب امریکی بغاوت ہوئی تو اس وقت نیویارک انگریزوں کے پاس تھا۔

ارجمند اس انفرمیشن سے نہ صرف بور ہوتی ہے، بلکہ بچ جاتی ہے۔آرام سے کار چلاؤ بلال۔یہ امریکن ہسٹری بیان کرنے کا کون سا وقت ہے۔

بچوں کو انفرمیشن دینا ماں باپ کا فرض ہے بلال غراتا ہے۔

یہ کون سی جگہ یا وقت ہے..... تم بار بار غلط اوورٹیک کر رہے ہو۔سڑکیں بدل رہے ہو اور پھر بچے اتنی پیچھے ہیں کہ تمہاری آواز بھی وہاں تک نہیں جا رہی۔

جو کچھ بھی ہے..... میرے پاس صرف یہی وقت ہے۔میں انہیں جاہل نہیں دیکھنا چاہتا..... سکول میں بہت کو چیسی ٹیشن ہے۔

گھر پر تو تمہیں سوائے فٹ بال دیکھنے کے کوئی وقت ہی نہیں ملتا..... یہاں ساری

کسر نکال رہے ہو۔

اب وہی بحث چل نکلتی ہے جو آج کے ماڈرن میاں بیوی کی زندگی میں زہر گھولتی رہتی ہے۔ دونوں اپنے آپ کو Over Worked, misunderstood اور Under-appreciated لیکن نیک دل سمجھتے ہیں۔

ہم سمندر کے نیچے سے گزرنے والی ایک ٹنل سے گزر رہے ہیں۔ میں ایک لمبی اونگھ سے جاگا ہوں۔ بلال اور ارجمند میں کسی موضوع پر خوش دلی سے اظہار ہوا ہے اور وہ دونوں ہنس رہے ہیں۔ جمشید اور قیصر چپس اور برگر کھا رہے ہیں۔

ماما اس نے میرے گھٹنے پر کچپ لگا دی ہے۔ جمشید چیختا ہے۔

ڈونٹ فائٹ ورنہ تمہارے بابا کوئی ڈرائیونگ کی غلطی کریں گے اور پھر پولیس آجائے گی۔ ٹکٹ ملے گا بابا کو قریباً ساٹھ ڈالر کا.....

میں مضبوط پکی ٹنل میں سے گزر رہا ہوں جو غالباً ہڈسن دریا کے نیچے بنی ہوئی ہے یا سمندر کے کسی حصے سے نیچے بنائی گئی۔ یہ ٹنل مجھے آپیا کی سہیلی اقبال تک لے گئی ہے۔ قریباً پینتالیس سال پہلے کے واقعات میرے ذہن میں گھومنے لگے ہیں۔ یہ پینتالیس سال سمندر کی طرف میرے وجود کے اوپر ہیں اور میں ایک ٹنل کے ذریعے اس وقت میں جا پہنچا ہوں، جب اقبال سے میری محبت اندر ہی اندر مجھے سرنگ کی طرح کھوکھلا کیے جا رہی تھی۔

اصغری کے ساتھ میں ٹمپل روڈ سے نکل کر سمن آباد میں جا بسا تھا۔ یہ آبادی بالکل نئی تھی اور اس میں صرف کچھ این ٹائپ گھر تعمیر ہوئے تھے۔ گلبرگ اور ڈیفنس کی آبادیاں ابھی مستقبل کی کوکھ سے برآمد نہ ہوئی تھیں۔ ماڈل ٹاؤن ایک پوش علاقہ شمار ہوتا تھا جس میں اونچے چھتنارے خوبصورت درخت تھے۔ بڑے بڑے Colonial بنگلے، آٹھ آٹھ دس دس کینال کے رقبوں میں جادوگر نظر آتے تھے۔ یہ ساری بستی ہماری سوچ اور پہنچ سے باہر تھی، کیونکہ نہر کے آگے ہماری کائنات ختم ہو

جاتی تھی۔

جب بھی آپیا اپنے سسرال سے آتی، اس کی کالج کی دوست اقبال ضرور ملنے آتی۔ اقبال کی وضع قطع، لباس انداز سب اونچے سرکاری افسروں کی طاقت کا غماز تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے اور شاہد بھائی کو احساس کمتری کا سامنا رہتا۔ ہم دونوں شاہد الیکٹرونک سٹور کی ایک معمولی سی دکان پر کام کرنے جایا کرتے تھے۔ آپیا کی شادی کے بعد شاہد مستقل طور پر دکان کی دیکھ ریکھ میں مصروف رہتے۔ انہوں نے بے اے کا امتحان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں بھی کالج سے واپسی پر چند گھنٹے شاہد الیکٹرونک سٹور پر گزارتا۔ شام کو کبھی اکٹھے اور کبھی علیحدہ علیحدہ ہم دونوں کافی ہاؤس جاتے۔ یہاں کی گرما گرمی، بحث بحثی اور خیالات کے لئے دھینگا مشتی کی فضا ہم میں جینے کی امنگ پیدا کرتی۔ ہم دونوں چوری چوری شاعر بننے کا عزم کئے بیٹھے تھے۔ میرا خیال تھا ناموری اور عزت کے لئے شاعری ایک شارٹ کٹ ہے۔ میں اپنے کھوکھلے پروفیشن کے لئے اسے بطور خوبصورت پیکنگ کے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں شاعری میں نام پیدا کر کے اقبال کے والد پر خاطر خواہ رعب گانٹھ سکتا ہوں۔ اقبال کی محبت میں کیا کچھ ہوا، کیسے ہوا۔ یہ تو میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا اور اس کی تفصیلات میں شاید آپ کو کچھ اتنی دلچسپی بھی نہ ہو، لیکن میری اس سے آخری ملاقات ان کے گھر پر ہوئی۔

اقبال کے والد ڈی پی آئی تھے۔ ان کا دفتر انارکلی شروع ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر تھا، لیکن کوٹھی ان کی جیل روڈ پر تھی۔ ان کی یہ کوٹھی الاٹ شدہ تھی، حالانکہ وہ مہاجر نہ تھے۔ گھر سے کچھ ہی دور Observatory تھی۔ میں کبھی کبھی آپیا کو اقبال سے ملانے جیل روڈ لے جایا کرتا۔ اس روز میں نہیں جانتا کہ اقبال کی منگنی ہونیوالی ہے۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا، کیسے ہوا، لیکن میں اکیلا ہی جیل روڈ پر پہنچ گیا۔

کوٹھی کے کشادہ برآمدے میں کرسیاں میز لگا تھا۔ میں نے اسی برآمدے میں اس

ستون کے ساتھ اپنی سائیکل ٹیک میں رکھ دی جو سارا بوگن ویلا کی بیل سے ڈھکا تھا۔
کچھ دیر میں باہر کی کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اندر طلب کر لیا گیا۔

اونچی چھت والا ڈرائنگ روم مئی کے گرم خشک موسم میں خنک تھا۔ ایک ملازم میرے لئے شربت لے آیا اور کوئی تیسری مرتبہ مودب طریقے سے گویا ہوا۔ سر گھر پر کوئی نہیں ہے۔ سوائے بی بی اقبال کے۔

اس سے پہلے میں نے کسی کا نام نہ لیا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ میں انتظار کر لوں گا۔
اس بار میں نے بڑی جرات سے کہا۔ بی بی اقبال کو بتائیں میں انہیں آپیا کا پیغام دینا چاہتا ہوں۔

کچھ دیر بعد اقبال آ گئی۔ اس نے لٹھے کی سفید شلوار، چنا ہوا دوپٹہ اور پھولدار پرنٹ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے دونوں شانوں پر لمبی لمی دو چوٹیاں لٹک رہی تھیں۔ جن میں گلابی ربنوں کے پھول نمایاں تھے۔ چہرے پر کوئی میک اپ نہ تھا۔ لیکن کشمیری رنگت دمک رہی تھی۔ ایوننگ ان پیرس کی خوشبو سے چھت تک کمرہ معطر ہو گیا۔

السلام علیکم جی۔

وعلیکم السلام

اقبال کھڑی رہی

میں بھی کچھ دیر بگلا سا کھڑا رہا۔

آپ بیٹھئے ناں۔

آپ بھی تو بیٹھیں۔

وہ صوفے پر گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گئی۔

جی آپیا، وہ پیام آپیکا کا؟ جی۔

آپیا آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ اسے جلد ہی ساہی وال جانا ہے۔ ان کے سسرال

والے بضد ہیں۔اگر آپ آج کل میں کسی وقت آسکیں تو.....

جی میں آجاؤں گی جی.....آج کل میں ملنے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، جیسے مجلس برخاست کا اعلان دے رہی ہو۔

ایک اور بھی بات تھی۔ذاتی سی..... مجھے علم نہیں کہ وہ بات میں کر بھی سکتا ہوں یا مجھے کرنی بھی چاہئے لیکن.....

وہ پھر گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گئی۔

مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ اقبال کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا؟ ہم دونوں محبت کے کس مرحلے میں تھے۔میرے گھر پر شاہد بھائی میرے لئے ایک رکاوٹ کا باعث تھے۔مجھے ان کی نظروں سے اس تعلق کا پتہ چلتا جو میں بھی اپنے اندر محسوس کرتا رہا۔اسی روک کے باعث میں اقبال کی جانب پوری سپیڈ سے بڑھ نہ سکا۔جیل روڈ کی کوٹھی میرے لئے آؤٹ آف Bounds تھی جب بھی میں آپیا کو لے کر اقبال کے گھر جاتا۔عموماً ہم ٹیکسی ان کے گیٹ پر ہی چھوڑ دیتے۔پھر میں تو برآمدے میں بیٹھا رہتا۔کبھی چائے پیتا، کبھی اخبار پڑھتا، لیکن میری رسائی کم ہی ڈرائنگ روم تک ہوتی۔اگر آپیا کو سارا دن گزارنا ہوتا تو پھر میں گھر چلا جاتا اور شام کو عموماً شاہد بھائی آپیا کو لے کر گھر آجاتے.....اقبال سے ملاقاتیں بہت رہیں۔اس سے باتیں بھی ہوا ہی کرتی تھیں۔مجھے یہ بھی وہم ہو گیا تھا کہ وہ میری طرف جی جان سے مائل ہے، لیکن اس کے باوجود ہم دونوں اظہار محبت میں گونگے تھے۔اس روز میں سر سے پاؤں تک ارادے کا زور لگا کر اس کے پاس پہنچا تھا۔

میں نے سنا ہے کہ آپ کی منگنی ہو رہی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی گلابی سی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

جی۔

کون خوش قسمت ہے وہ۔

خوش قسمت نہیں بدقسمت..... اقبال نے جملہ مکمل نہ کیا۔

میرے ارادے میں جرات کا اضافہ ہوا۔

ایک نثار صاحب ہیں۔

بہت امیر کبیر؟ میں نے پوچھا۔

جی..... آئس فیکٹری ہے باپ کی، خود سول سروس میں ہیں۔

بہت ہینڈسم۔

ہاں جی..... ٹینس کھیلتے ہوئے اچھے لگتے ہیں اقبال بولی۔

پھر تو مجھے کوئی بات نہیں کرنا چاہئے۔ اتنی خوبیوں والے کے سامنے..... پٹرومیکس کے آگے دیا کیا جلے..... مجھے رونا سا آگیا۔ ہال روڈ پر وہ دکان جس میں پرانے ٹائپ رائٹر ریل والے ٹیپ ریکارڈ چھوٹے چھوٹے ریڈیو، استریاں ہیٹر پڑے تھے، نظروں میں وہ سارے شیلف الماریاں گھوم گئیں۔ اپنا وہ میز بھی یاد آیا جس پر کاویا، چھوٹے اوزارت، کرنٹ دیکھنے والا پیچ کس، پلاس، ہتھوڑی، برمے پڑے تھے۔ وہ ایک مستری کی بات کیا سنے گی۔ مستری بھی ایسا جس نے کسی انجینئرنگ کالج سے تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ بس پرانے الیکٹرک گڈز کھول بند کر کے تجربوں سے کچھ شدھ بدھ حاصل کر لی تھی۔

میری تعلیم بھی ابھی مکمل نہیں۔

مجھے معلوم ہے۔

اگر مکمل بھی ہو جائے تو ایم اے پولیٹیکل سائنس کو کون پوچھتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ لیکچرار لگ جاؤں گا، کسی قصباتی کالج میں۔ اوپر سے مہاجر بھی ہوں۔

میں نے تو ابھی بی اے کا امتحان دینا ہے۔ جی کون جانے دیا بھی جاتا ہے کہ نہیں؟

پتہ نہیں کیوں یہ جملہ مجھے گلوکوز کی ڈرپ بن کر لگا۔

ابھی شہر میں کوئی ایم بی اے، ایم پی اے، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن ڈش کیبل نہ

تھا۔ابھی تھرڈ ورلڈ کے لئے یہ سب کچھ ایجاد نہ ہوئے تھے۔ہم لوگ تو ابھی چھرے والی بوتل پی کر ہی خوش ہوتے تھے۔کون، آئس کریم کوکا کولا، کے ایف سی، میکڈونلڈ، چینی تھائی کھانے سب ابھی وقت کی ردا میں چھپے ہوئے تھے۔ابھی موسم آتے تو محسوس ہوتے۔محبت ہو جاتی تو اس کی خوشبو سوتے جاگتے ساتھ رہتی۔سارے نظام رب العزت چلاتا اور والدین کی حکومت زندگی اور گھر پر نافذ رہتی۔بہن بھائی سے رشتہ جڑا رہتا۔دوستی آسانی سے ٹوٹنے والی چیز نہ تھی ...... زندگی کی آبیاری کے لئے بازار، اشتہار، مادی سہولتیں درکار نہ تھیں۔پھر اونچ نیچ کا احساس شدید تھا۔بھانت بھانت کے لوگ مختلف علاقوں سے اکٹھے ہو گئے تھے اور نئے چہرے خوفزدہ کرنے کو کافی تھے۔لوگ گھرانوں میں ذاتوں میں، طبقاتی نشیب و فراز میں بٹے ہوئے تھے۔لوگ مختلف مقامات سے اٹھ کر پاکستان میں اس امید پر آئے تھے کہ سارے اختلافات مٹا کر ایک قومی تشخص کا حصہ بن جائیں گے۔میں بھی اسی امید کو لے کر آیا تھا کہ اقبال کی محبت ڈمپل ہے جو ہال روڈ کی دوکان اور جیل روڈ کی کوٹھی کو ملا سکتا ہے۔

لیکن!

اگر اقبال ...... آپ شاعری کو کچھ اہمیت دیتی ہوں ...... تو میں ...... ایک کواٹی ایسی پیش کر سکتا ہوں جو نثار صاحب میں نہیں ہے۔

میرے نزدیک تو شاعری الہام کے قریب ہے، لیکن ڈیڈی شاعری کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔

اچھا تو میں چلتا ہوں پھر۔

بیٹھیے ناں۔

اتنی دیر میں باوردی بیرا ایک گلاس وِمٹو کا اور لے کر آ گیا۔کمرے میں پہلے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو پھیلی تھی اب اس میں وِمٹو کا اضافہ ہوا ...... وہ گلاس پکڑا کر رخصت ہو گیا۔

کیا میں آپ کے ابا جی سے بات کر سکتا ہوں۔

آپ؟ کیسی بات وہ گھبرا گئی۔

میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اقبال ..... میں نے یہ جرات اپنے ان خوابوں سے مستعار لی ہے جو میں کئی سالوں سے دیکھ رہا ہوں.....

لیکن اب اس کا فائدہ..... وہ فیصلہ کر چکے ہیں اور وہ فیصلے بدلہ نہیں کرتے۔

میں نے محسوس کیا یا شاید میری خواہش نے اسے یوں دیکھنے پر مجبور کیا۔ ایک موٹا سا آنسو اس کی گال پر موتی سا لٹک گیا۔

اسی آنسو نے میرے حوصلے بلند کر دیئے۔ میں اپنے اندر فرہاد کی روح کو کلہاڑے سے نہر کھودتے دیکھ رہا تھا۔

مجھے ایک بار..... صرف ایک بار اپنے ابا جی سے ملا وہ..... میں ان کے منہ سے انکار سننا چاہتا ہوں۔

اقبال نے منہ پرے کر لیا اور پھر اٹھتے ہوئے بولی..... ایکسوزمی..... پھر میں کبھی ڈیڈی سے محبت نہ کر سکوں گی..... اسی لئے آپ ڈیڈی سے نہیں مل سکتے۔

وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس زمانے میں لڑکیاں غسل خانے میں چھپ کر رویا کرتی تھیں۔

وٹو کا گلاس ختم کرنے کے بعد میں ہال روڈ کی دکان پر چلا گیا۔ متذبذب تھا کہ میں اقبال کے ڈیڈی کو کیا پیش کروں۔ شاید میرے ساتھ ایونگ ان پیرس کی خوشبو چلی آئی، کیونکہ گھر پہنچ کر شاہد بھائی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

سٹیشن ویگن لانگ آئی لینڈ کے بہت قریب تھی۔

میں بوڑھوں کی لمبی اونتھ سے جاگ کر گرد و پیش کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ نہ جانے پاس سمندر کا ساحل تھا کہ ہڈسن دریا بہر ہا تھا۔ ہم مین ہیٹن جزیرے سے گزر چکے تھے کہ نہیں۔ میں لانگ آئی لینڈ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن

ارجمند اور بلال میں زور شور کی بحث ہو رہی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ ان کی اس گرما گرمی کے باعث کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ مجھے مختار شیخانوف کی رزمیہ نظم یاد آ گئی۔ اس قازق شاعر نے روحانیت اور اخلاقیات کے بنیادی اصولوں کے انحراف کو انسانی تشخص کی بربادی کا ضامن ٹھہرایا ہے۔ میں آپ کو بیاض قدیم کی ایک کہانی سناتا ہوں۔ اس نثری نظم کا عنوان شاید یہ تھا۔ ایک نظر آدمیوں پر یا شاید ایک موقع جو ہمیشہ عورت کو ملتا ہے۔

سنا ہے کہ اوترار کے قدیم شہر میں ایک غریب کریم نامی آدمی رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک شاہانہ، نسل در نسل صحیح نسب کا ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑے کی صفت تھی کہ وہ کبھی کسی بدرو سے پانی نہ پیتا، بلکہ پیاسا رہ کر کسی شفاف ندی کے انتظار میں رہتا۔ کریم کی بیٹی نے ایک دن باپ سے کہا..... تمہارا گھوڑا بہت بدخو ہے، کیوں نہ ہم اسے بیچ ڈالیں یا کسی اور گھوڑے سے اس کو بدل ڈالیں ایسے درشت گھوڑے کا فائدہ؟

کریم دکھی ہو کر بولا..... ''دیکھ بیٹی! اس کی نازک مزاجی اس میں رواں اعلیٰ خون کے باعث ہے۔ یاد رکھ ایسا حساس گھوڑا ہی پلک جھپکنے میں سب سے آگے نکل سکتا ہے۔ اپنی نسل کا افتخار ہی اس ارادے کا مضبوط اور وفادار بناتا ہے۔ مجھے ڈر ہے بیٹی تم ایسا صاحب افتخار شجاع شوہر نہیں چن سکو گی جو مضبوط کردار کا مالک بھی ہو۔ تم ایک بوڑھا ٹٹو شوہر تلاش کرو گی جو اطاعت شعار مسکین ہو..... جدھر تمہاری رضا ہو، اسے ادھر کو ہانک سکو۔ تم اس پر بیٹھ کر سواری کرو گی۔ یاد رکھو کہ راکب اور مرکب ایک سے ہوا کرتے ہیں۔ میں تمہیں انتباہ کرتا ہوں کہ مرد کو احساس عزت و افتخار ہی مرد بناتا ہے۔ جو مانگے کے سائے میں چلتا ہو، اپنی رائے نہ رکھتا ہو، اسے مرد کیسے کہیں گے؟ ہر جنس کی اپنی کشش ہے، دانش بھری عورت وہ ہوتی ہے جو گردش کے راستوں پر چلتی ہے اور اپنے دکھڑے کسی کو نہیں سناتی، نہ ہی کسی کے سامنے روتی ہے ..... یاد رکھو جو عورت یہ موقع کھو دیتی ہے وہ عمر بھر رقص زیست کو روتی ہے۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ ارجمند نے روشن پیشانی، حساس نتھنے اور اکی گردن والے بلال کو چنا تھا..... وہ شاہی گھوڑے سے بیاہی گئی تھی، لیکن اطاعت شعار، مسکین ٹٹو کی خواہش نے اس کے رقص زیست کو جنگی ورزش میں دل رکھا تھا۔

ہم لانگ آئی لینڈ کے ایسے گھر میں بیٹھے تھے جو ہر جانب سے درختوں میں گھرا جنت کا ٹکڑا لگ رہا تھا۔

سامنے نثار صاحب بیٹھے تھے۔ان کی بارہ سالہ بیٹی میرے ساتھ صوفے پر تھی۔

پتہ نہیں ڈیزی کدھر چلی گئی ہے..... خیر ابھی آجائے گی۔

انکل آپ پہلی بار لانگ آئی لینڈ آئے ہیں؟ نثار کی بیٹی سارا نے مجھ سے سوال کیا۔

ہاں بیٹی پہلی بار آئے ہیں۔آپ تو بڑے خوبصورت علاقے میں رہتی ہیں۔

یہاں بڑے ٹوپ نوچ لوگ رہتے ہیں۔ہلری کلنٹن نے بھی یہاں گھر خریدا ہے۔

میں آپ کو دکھا کر لاؤں گی انکل۔

جمشید اور قیصر دبادب چپس کھانے میں مشغول ہیں۔ بلال اور ارجمند تھوڑی دیر پہلے ہونیوالی بحث بھول چکے ہیں۔اس وقت لگتا ہے کہ کہ ارجمند چھوٹی سی لڑکی ہے اور اس کے تسمے باندھنے والا بلال حقیقت میں اس کا بڑا بھائی ہے۔

میں انہیں سیونگ پر لے جاؤں انکل بلال؟ سارا بولی۔

ضرور۔

لیکن..... ارجمند کچھ گھبرا جاتی ہے۔

بالکل سیف ہے ارجمند سامنے ہی ہے۔ وہاں ایک گارڈ بھی ہر وقت موجود رہتا ہے۔

تینوں بچے باہر نکل جاتے ہیں۔

اقبال کا کہیں اتا پتا نہیں۔صرف پینتالیس برس پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔نہ جانے اب کیسی لگتی ہوگی۔کیا دانتوں کا Denture اسے سوٹ کیا ہوگا؟ کیا جسم

فربہ ہو چکا ہے؟ آواز میں وہ حلاوٹ رہی بھی کہ مردانہ نام نے اس نرمی کا گلا گھونٹ دیا؟ اقبال کے ساتھ اپنے اندرونی تعلق کا میں کبھی تعین نہیں کر سکا۔ اس میں کہیں شدت نہ تھی اور اس کے باوجود گرم پانی کی بوتل کا وہ سینک تھا جو میں ابھی تک محسوس کرتا چلا آتا تھا۔ بوتل جو ابھی تک ٹھنڈی نہ پڑی تھی۔ وہ ہیٹر نہیں تھی ایک کانگڑی تھی ادھ جلی، جسے میں گود میں اٹھائے پھرتا۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا تھا، نہ کوئی ایسی یادیں تھیں جنہیں ہم دونوں مل کر دوہرا سکتے بس..... بس شعاعیں سی تھیں جو ڈوبتے سمے دریا کی سطح پر پڑا کرتی ہیں۔

میں نے نثار کی جانب غور سے دیکھا۔ اس کی پشت پر ایک بوڑھے قازقستان کی بڑی سی تصویر ٹنگی تھی۔ مجھے گل گایہ کریم قازقستان میرے بھید کو جانتا ہے اور مجھے کوئی نصیحت کرنا چاہتا ہے۔ قبر میں گڑے مردے سے متعلق کوئی ایسا مقولہ اس کے پاس ہے، جو میرے اندر پڑی گانٹھ کو کھول سکتا ہے۔

سامنے نثار بیٹھا تھا۔

کیا یہی نثار تھا جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ وہ ٹینس کھیلتا بہت خوبصورت لگتا ہے۔ کیا وہ نثار کوئی اور تھا جس کے مرنے کی خبر اخبار میں پڑھ کر میں نے بڑی راحت محسوس کی تھی۔

نثار کا قد چھ فٹ سے کچھ کم تھا، لیکن اب اس خمیدہ قد میں شاہ بلوط کی خوبی نہ تھی۔ ماتھا فراخ ہو کر گنجے پن میں بدل گیا تھا۔ بال سارے سفید، لیکن چمک سے عاری تھے۔ میں اسے پوچھنا چاہا کہ وہ اپنی سروس میں کہاں رہے اور میں تب انسے کتنے فاصلوں پر رہا پھر سوچا یہ تفصیلات تو ارجمند سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ پھر ان تفصیلات سے ملنا بھی کیا تھا۔ ایک ہی شہر میں کیا پرانے دوست اجنبی نہیں ہوتے کیا۔ مجھے لگا نثار تنہائی زدہ تھا۔ بلال اور ارجمند ایسے پیش آ رہے تھے جیسے بڈھے انکلوں سے ازراہ مروت پیش آیا کرتے ہیں۔ وہ امریکنوں کا مذاق اڑانے میں مشغول تھا۔

ساتھ ہی ساتھ یوں بھی لگتا تھا کہ اسے امریکن جی جان سے پسند آئے تھے۔ گھوم پھر کر وہ پاکستانیوں کے خلاف بے شمار الزامات بیان کرنے میں مشغول ہو جاتا۔

یہاں ہم لوگ کو نہیں، بھانت بھانت کے پنچھی اکٹھے ہو گئے ہیں۔ جس قدر Ethnic ورائٹی امریکہ میں ہے اتنی تو کہیں اور نظر نہیں آتی۔ بلال نے کہا۔

نہیں جی یہ بات نہیں ہے۔ آدمی امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی امی گرنٹ نہیں رہتا۔ امریکن ہو جاتا ہے۔ اس کی آنول کٹ جاتی ہے اسی وقت نثار نے جواب دیا۔

نثار صاحب کے خیالات میں کہیں کوئی ٹیڑھ، ترچھا بن، کجی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ اقبال کے شوہر ہیں تو انہوں نے اس پیاری سی لڑکی کو کیسا ٹف ٹائم دیا ہو گا۔

پاکستانی لوگوں کا ایک المیہ ہے۔ نثار صاحب صرف ایک المیہ ..... میں نے کہا۔

بلال اور ارجمند ہم دونوں بڈھوں کی گفتگو سے تھوڑے تھوڑے اکھڑے گئے تھے۔ وہ اپنے انکل نثار کا حال چال پوچھنے آئے تھے اور اب باپ اور انکل سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ میں تو شاید انہیں نیچا دکھانے کے چکر میں تھا، لیکن نثار بھی طبعاً جھکی، جھگڑالو، جنگ جو بڈھا تھا۔

وہ المیہ کیا ہے بیان کیجئے۔

''ساری دنیا کے باشندے پہلے وطن پرست ہوتے ہیں۔ بعد میں ان کی دوسری تعریفیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جرمنی کا باشندہ پہلے جرمن ہے پھر عیسائی ہے۔ اس کے بعد اس کی دوسری کوئی کوالیفکیشن پیش کی جائے گی۔ امریکن اپنا تعارف پہلے امریکن کہہ کر کراتا ہے۔ اس کے بعد کوئی اور شناخت سامنے آتی ہے۔ مثلاً اٹالین، ڈچ، جرمن کے اصلی اور یجن کا بعد میں پتہ چلتا ہے۔ وہ خدا پرست ہے کہ سیکولر خیالات کا مالک ہے۔ یہ بعد کی شناخت ہے ہندی پہلے اپنے آپ کو ہندوستانی ظاہر کرتا ہے، بعد میں آپکو پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کون سے

مذہب کا آدمی ہے۔چینی، جاپانی..... ایرانی، عرب سب کی پہلی پہچان اور شان ان کا وطن ہے..... ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم بھوک اور شیخی میں آکر سب سے پہلے اپنے آپ کو لبرل، انسان دوست ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ہم دنیا میں یہ ظاہر کرنے کے درپے ہیں کہ ہم میں کوئی تعصب، گھٹیا پن اور کمینگی نہیں۔ہم اس قدر اعلیٰ وارفع ہیں کہ وطنیت ایک چھوٹی، گھٹیا اور معمولی شناخت ہے۔ہم انسان دوست ایسی متعصب باتیں نہیں کیا کرتے۔جرمن ہر قدم پر جرمن رہتا ہے، امریکن ہر لمحہ امریکہ ہوتا ہے، لیکن پاکستانی ہر وقت انسان دوست، لبرل اور بلندیوں کا شاہین ہے، اسی لئے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی شناختیں پیش کرتا ہے وہ بھی لجاجت اور خفت کے ساتھ۔زیادہ ضرورت پڑ جائے تو وہ اپنے آپ کو مسلمان ظارہ کرے گا۔غریب شہر ہر اجنبی کو بتائے گا کہ وہ سندھی، بلوچی، سرحدی یا پنجابی ہے۔وہ لوگ جو پاکستان کو بھی دنیا کے نقشے پر Place نہیں کر سکتے، وہ اس تعارف سے ایک دم پریشان ہو جاتے ہیں۔وطن پرستی سے تو شناخت عامہ میں کچھ سہولت ہو سکتی تھی، لیکن اس تعارف سے جان بین میں دھند بڑھتی ہے۔پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدلے کچھ پاکستانی اپنے آپ کو شامی، ترکی، ہسپانوی ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ہم شیخی خورے اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لئے جا بجا دوسروں کی معتبری کو اپنا شناختی کارڈ بنا لیتے ہیں۔نثار سے مجھے بغض پیدا ہو چکا تھا۔حالانکہ اس کی بنیادی وجہ کوئی نہ تھی"

ہم لوگ یہاں وطن کے ستائے ہوئے آئے ہیں۔ہم کیا وطن پرست ہو کر دکھائیں گے؟ بات اتنی سی ہے نثار فوراً بدل گیا۔

ہمیں وطن رحمت کے طور پر ملا، لیکن ہم اس کے شکر گزار نہ ہوئے۔ہم لوگ دراصل نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا نہیں جانتے۔ہم نقص بین لوگ ہیں۔ہمیں من وسلویٰ راس نہیں آتا۔ہر نعمت میں کوئی کمی دریافت کر کے ہم احسان اور شکریے کے بوجھ سے نکلنا چاہتے ہیں۔اگر ہم نے یہاں اپنے آپ کو پاکستانی اور مسلمان ظاہر کیا تو ہم اندر سے